

اقبال

مرکزی مکتبہ لامی دہلی

مطبوعات اشاعت اسلام پرسٹ — ۳۶۱

اقبالیات

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرتبہ

سمیع اللہ ☆ خالد ہمایوں

مرکزی مکتبہ اسلامی
دہلی

مضاہیں

- ۱- اقبال کا اصل کارنامہ ۳
- ۲- حیاتِ اقبال کا سبق ۱۹
- ۳- اقبال - عہد ساز شخصیت ۲۴
- ۴- سرو درفتہ ۳۱
- ۵- شدرات ۳۶

بادرادل — جنوری ۱۹۴۹ء ۳...

قیمت: — ۱/۵۰

مطبوع
تاج آفست پرنس دہلی

اقبال کا اصل کارنامہ

علامہ اقبال نے اسلامی تاریخ میں جو عظیم الشان اصلاحی کارنامہ انجام دیا۔ اگرچہ وہ بجا لئے خود نہایت قیمتی ہے، لیکن اس کی قدر و قیمت اس وقت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جب تک اس بات پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ انہوں نے کتنے حالات میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ کسی مصلح کے کام کو جانپنے کے لیے صرف یہی دیکھنا کافی نہیں ہوتا کہ اس نے کیا کام کیا ہے، بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء تک کیا تھے جن میں اس نے وہ کام کیا۔

۱۹۴۷ء تک کا ہندوستان اور علامہ اقبال

میں ایک مختصر طریقے سے آپ حضرات کے سامنے ماضی تیر کی تاریخ کا ایک درج کھولنا چاہتا ہوں۔ اس تاریخ سے میں خود بھی گزر ہوں اور میں نے اپنے آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا ہے — ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ مذکون کے مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین زمانہ تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے سحریک خلافت میں اپنی تمام تر لوچی لگادی تھی۔ ان کو یہ احساس تھا کہ خلافت اسلامیہ کو بچانے کے لیے اور مسلمانوں کے مقامات مقدسے کو اغیار کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے وہ ہمیں کر گز رنا چاہیئے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے

اپنامال خرج کرنے میں کوئی کسر انہار کھی اور نہ اپنی جانمیں قربان کرنے میں کوئی ذریغ کیا
 وہ اس مقصد کے لیے اس حد تک گئے کہ جن ہندوؤں کے متغلق ان کو صدیوں سے تجزیہ
 تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے باسے میں کیا جذبات رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان کے
 ساتھ بھی محض اس امید پر اتحاد و تعاون کرنے میں کوئی کسر انہا زر کھی کہ کسی طرح سے
 ہم خلافت کے ادارے کو بچا لے جائیں اور اپنے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضے
 سے چھڑا لیں، لیکن آخر کار اس ساری تگ و دو کا جواب نجماں ہوا وہ یہ تھا کہ جس خلافت
 کو بچانے کے لیے انہوں نے سرد صدر کی بازمی لگائی تھی اس کی بساط اپنی لوگوں
 نے پھیل دی جس کی خلافت کے لیے مسلمان کو شمشش کر رہے تھے اور جن
 مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے وہ اپنی جان لڑا رہے تھے انہی مقامات مقدسہ
 کے رہنے والے قومیت کے بٹ کے پرستار بن گئے اور انہوں نے آپس میں
 کشت و خون شروع کر دیا۔ آپس میں عداوتیں اور لڑائیوں پاؤ تراۓ اور وہ خود
 ہی مقامات مقدسہ پر اغیار کے مستقل قبضے اور تسلط کا ذریعہ بن گئے۔ ایک طرف تو
 ہندوی مسلمانوں کو خلافت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی ساری کوششوں کا یہ تیج
 دیکھنا نصیب ہوا اور دوسری طرف جس کا نگریں کے ساتھ انہوں نے اتحاد اور جن
 ہندوؤں کے ساتھ انہوں نے تعاون کیا تھا وہی ان پٹوٹ پڑے اور ۱۹۴۷ء سے
 ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سارے عرصے میں کانگریس کے لیڈر و
 کو ان لوگوں کی مذمت کرنے کی کبھی بہت نہ ہوئی جو مسلمانوں کے ساتھ یہ منظام کر
 رہے تھے — گویا مسلمانوں کو اس مرتع پر دوہری شکست سے دو چار ہونا پڑا۔
 ایک طرف جس مقصد کے لیے جان لڑائی تھی وہ مقصد فوت ہو گیا اور دوسری طرف
 جن لوگوں سے اتحاد کیا تھا وہ مسلمانوں سے رہنے اور ان کو تباہ کرنے کے دلپے
 ہو گئے۔ سب سے زیادہ انہوں نے گاندھی جی پر اعتماد کیا تھا اور انہیں اپنالبد

بنایا تھا، مگر خود انہی کو کبھی اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس مرحلے پر مسلمانوں پر پہنچ دو۔ کی زیادتیوں کے خلاف زبان کھولتے۔ اس صورت حال کا تفسیر یہ ہوا کہ مسلمانوں پر یکاک ایک سخت مایوسی طاری ہو گئی اور ان کی ہتھیں ٹوٹ گئیں۔ میں اس زمانے میں ہونے والے ان سائے حالات کا شاہد ہوں اور بکثرت ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے سامنے یہ ساری تاریخ گزری ہے کہ کس طرح مسلمان ایک شدید مایوسی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اس کے ساتھ اس ساری لیڈر شپ سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا، جس نے تحریکِ خلافت الٹھائی تھی اور اس میں کانگریس کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ اب طرح مسلمان مایوس بھی ہو گئے اور بے قیادت بھی رہ گئے۔ پوری قوم میں ایک ہمہ گیر اور شدید انتشار کی کیفیت رونما ہو گئی۔ اس انتشار کی حالت میں مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ مسلم ایک لیڈر کی لیڈر شپ میں پوری طرح سے متعذ ہیں اور ہندوستان پر اپنے قبضے کو مکمل کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف مسلمان بالکل اس قابل نہیں تھے کہ اس صورت حال کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے تحفظ کی کوشش انجمنی کے لیے تیار کر سکیں۔

ایک طرف تو یہ مصیبت تھی اور دوسری طرف عین اسی زمانے میں یہ فتنہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کے اندر الحاد و دہریت کی تحریکیں انھی شروع ہوئیں اور اسلام کی خفانیت پر کھلکھلے کیے جانے لگے مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی اس طرح علانية الحاد و دہریت کی دعوت نہیں انھی تھی جس طرح کی اس زمانے میں انھی مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں کمیونزم کی اشاعت شروع ہو گئی۔ پورے پورے رسائل و جسمانی اس غرض کے لیے نکلنے شروع ہو گئے کہ مسلمانوں میں الحاد و دہریت کی تبلیغ کریں۔ اخلاقی بے قیدی کی تعلیم مسلمانوں کو دی جانے لگی اور کھلکھلادی

جانے لگی۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہونے لگی کہ کوئی شخص پڑھا لکھا بھی ہوا دردہ خدا کو بھی مانتا ہوا دنماز روزہ جیسے احکام کی پڑی بھی کرتا ہو۔ انداز نظر اس حد تک بدلا کر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ چون شخص نماز پڑھ رہا ہے اس کو اپنی حرکت پر شرمنا چاہیئے، جو نہیں پڑھ رہا ہے اس کو شرمانے کی ضرورت نہیں۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی و نظریاتی احتلال کا یہ عالم تھا اور اس کے ساتھ جس مصیدت میں وہ گرفتار تھے وہ یہ تھی کہ ان کی کوئی قابل اعتماد تباہت اس وقت موجود نہیں تھی۔ جن لوگوں نے جنگ عظیم اول سے پہلے اور جنگ کے زمانے میں حصہ حذکر بھی ہو سکا تھا اسلام کے علم کو بلند رکھا تھا وہ یا تو خاموش ہو چکے تھے، یا مسلمانوں کے اندر ان کے اثر و لفозд کو نقصان پہنچ چکا تھا، یا انہوں نے اسلام کی دعوت کا راستہ چھوڑ کر قومیت اور وطنیت کی دعوت کا راستہ اختیار کر کیا تھا۔ اس عالم میں صرف اقبال و شخص تھا جس نے اس پوری صورت حال کا مقابلہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک چودہ سال کی مدت میں اسلامی تحیر کیب اور اسلامی خذبے کے اجیاء کے لیے اور مسلمانوں میں اسلامی اور ملی شعور کو انجام نے اور بیار رکھنے کے لیے اگر کوئی سب سے بڑی طاقت کام کر رہی تھی، تو وہ ایکیے اقبال کی طاقت تھی۔ جو لوگ بھی کلام اقبال پڑگاہ رکھتے ہیں اور انہوں نے ان کی نظم و نشر پڑھی ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ اقبال نے ہندوی مسلمانوں کے گرتے ہوئے وقار کو بچانے اور انہیں اپنے مذہب مہرے ملی شخص کو بچانے کے لیے کس طرح آمادہ کا رکیا اور اس غرض کے لیے انہوں نے نظم و نشر دنوں کی قوت سے کام لیا۔

اقبال کے کارنامے کو ہم مختلف عنوانات کے تحت بیان کر سکتے

مغربی تہذیب پر ضرب کاری

سب سے اہم کام جو اقبال نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربیت اور مغربی مادہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگانی۔ اگرچہ یہ کام اس وقت نہ ملائے، میں اور اہل مدارس اور خطیب حضرات بھی انجام دے رہے تھے، مگر ان کی بالتوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جانا تھا اور کیا جاسکتا تھا کہ یہ لوگ مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب تدن سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لوگ ان اہل علم کی بات کو کچھ زیادہ وزن نہیں دیتے تھے جو اگرچہ دین سے تو واقع تھے، لیکن مغربی علوم، مغربی فلسفہ، مغربی تہذیب اور مغربی زندگی سے پوری طرح واقع نہیں تھے۔ ان کے برعکس اقبال وہ شخص تھا کہ وہ اس سے زیادہ مغرب کو جانتا ہے اور اس سے زیادہ مغرب کے فعلے اور مغربی علوم سے واقع ہے۔ اس لیے جب اقبال نے مغربیت، مغربی مادہ پرستی، مغربی فلسفہ اور مغربی انکار پر پڑتال کیا، تو مسلمانوں پر مغرب کی جو مروعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقع یہ ہے کہ اس مروعوبیت کو تواریخ میں اکیلے اقبال کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے۔

اگرچہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی جسمانی غلامی تورنے کے لیے بھی کوشش کی اور ان کو آزادی کا سبق بھی دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا ذہن اگر غلام ہو تو خواہ اس کا جسم آزاد بھی ہو جائے تب بھی وہ قوم آزاد نہیں رہ سکتی۔ اس وجہ سے اقبال نے مسلمانوں کی اس ذہنی غلامی کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جوان پر طاری ہو گئی تھی۔ اقبال کا یہ خود می کا فلسفہ جس کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی چلستان یا معتمہ ہے، یہ درحقیقت اس بات کے لیے تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو پھانپیں کر دے کیا ہیں۔ واقع یہ ہے کہ مسلمان لپنے آپ کو معمول کرنے تھے ان

کو اپنی تاریخ سے شرم آتی تھی، وہ اپنی روایات، اپنی تہذیب اپنے عقیدے اور اپنی اخلاقی اقدار کے باعث سے میں شدید احساس کتری کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ صحیح تھے کہ اگر دنیا کی تاریخ میں کوئی قابل قدر حیز ہے تو وہ صرف اہل مغرب کی پیش کی ہوئی ہے یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی انسلوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کا اپنا سرماہہ کیا ہے۔ اس موقع پر اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ تم دنیا بھر میں سب سے زیادہ قابل فخر تہذیب رکھتے ہو۔ تمہارے پاس دنیا کا بہترین نظام حیات ہے اور تم سب سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ اخلاقی اقدار رکھتے ہو۔ اپنی خودی کو پہچانو اور اپنے آپ کو جانو کہ تم کیا ہو۔ تم نے اپنے آپ کو لکھو دیا ہے اور اپنی حقیقت کو گم کر دیا ہے۔ اپنے قومی تشخص کو سمجھو اور اپنی تہذیب سر بلندی کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ۔

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ اسلام کوئی پرانا اور از کار رفتہ نظام نہیں ہے جو اس زمانے میں کام نہ کر سکتا ہو۔ اس نے اپنے شعر سے بھی اور اپنی نثر سے بھی یہ بات مسلمانوں کے ذہن لشیں کی کہ اسلام ازلی اور ابدی اصولوں کا حامل ہے۔ اسلام کسی وقت بھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصول ہر زمانے میں یکساں قابل عمل ہیں۔ اگرچہ اسلام کی حقانیت کی شہادت اس وقت علمائے دین منبروں پر بھی دے رہے تھے اور مدرسیں بھی، لیکن جب اس مغربی تہذیب کی آنکھیں میں پرورش پائی ہوئے اور مغربی فلسفے پر عبور رکھنے والے آدمی نے اٹھ کر اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو مسلمانوں کے قلوب واڑاں پر اس کا نہایت گہرا اور پائیدار اثر پڑا۔ اس وقت مختلف نسلتوں کی یلغمار کے درمیان مسلمانوں کی جو نسل گمراہ ہو رہی تھی اس کو بچانے کے لیے اہل منبر وہ کام نہیں کر سکتے تھے جو مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی علوم میں مہارت کا ملہ رکھنے والا یہ آدمی انجام دے

سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جب اُن نے ایک بادشاہ پر اعتماد اور مجتہد نہ شان کے ساتھ اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو نئی نسل کے اندر ایک نیا اسلامی شعور پیدا ہوا۔

وطنی قومیت کی تردید

اس کے ساتھ علامہ اقبال نے جو علمیہ کارنامہ انجام دیا وہ یہ ہے کہ انہوں نے وطنی قومیت اور قوم پرستی پر ایک شدید ضربِ لگانی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انہوں نے قوم پرستی، نیشنلیزم اور وطنی قومیت پر بروقت ضرب کاری فرما گئی ہو تو آگے چل کر مسلمانوں کو گانگوں میں جذب کرنے کے لیے جو تحریک اٹھی تھی اس سے مسلمانوں کا پچ جانا محال تھا۔ ایسے حالات میں کہ جب علمائے دین تک انہوں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت کا درس دینے لگے تھے اور مسلمانوں کے بڑے بڑے متفقی علماء تک مسلمانوں سے یہ کہنے لگے کہ وطنی قومیت سے تمہارے دین کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس موقع پر یہ صرف اقبال تھا جس نے پری شدت کے ساتھ اس تباہ کن تصور کا تاسو پوچھیا اور لوگوں کو پوری قوت کے ساتھ یہ بتایا کہ وطن بھی ایک بتا ہے اور وطن کی پستش کرنا بھی دیساہی شرک ہے جیسا کہ کسی بت کی پستش کرنا شرک ہے۔ اگر اقبال نے یہ علمیہ بروقت نہ دی ہوتی تو بعد میں گانگوں نے اپنے عوام (MASS CONTACT) کی جو تحریک شروع کی تھی اور جس میں علماء اور اشتر اکی حضرات بھی شرکیے تھے، وہ تحریک مسلمانوں کو ہندوؤں کے اندر اس طرح لکھا رہی جلیسے نک پانی کے اندر لگھل جاتی ہے، لیکن اقبال نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ قومیت وطن اور زمان سے نہیں بنتی ہے بلکہ قومیت دین اور عقیدے سے مبتی ہے۔ اس نے مسلمانوں میں اس شعور کو بیدا کیا کہ تم ایک عقیدہ اور ایک تہذیب رکھنے والی قوم ہو، تمہاری قومیت ان لوگوں سے باہل

مختلف ہے جن کی تہذیب اور عقیدہ و مسلمانوں سے اگر ہے۔

وحدتِ ملی کا احساس

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس بھی ابھارا کہ تمام دنیا میں ملتِ اسلام یہ ایک وحدت ہے اور اس کو ایک وحدت ہونا چاہیے۔ اس طرح انہوں نے بیک وقت دو کام کیے ۔۔۔ باہر کی دنیا میں مسلمان جس طرح قوم پرستی میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے کٹتے ہے تھے اور ایک دوسرے کو کٹتا ہے تھے اور جس طرح ترکوں اور عربوں کے درمیان ایک المانگ کش مکش برپا ہوئی اور اس کے نتیجے میں شرق اور سطح پر جو تباہی آئی اور تمام ممالکِ اسلام میں صیانت میں مبتلا ہوتے وہ سب اس قوم پرستی کا نتیجہ تھا جس کی تبلیغ و اشاعت عیسیٰ میں نے عربوں اور ترکوں کے درمیان کی تھی ۔۔۔ ایک طرف تو اقبال نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ تم ایک ملت واحده ہو اور جس قوم پرستی میں تم مبتلا ہو یہ ایک بالکل غلط اور جہدک تصور ہے اور دوسری طرف انہوں نے بندی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قوم اور ایک ملت ہو۔ تمہارا کسی دوسری قوم میں جذب ہونا سارے ایک باطل نظر ہے۔ اگر اقبال نے بروقت یہ اقدام نہ کیا ہوتا اور اسلامی توریت کے صحیح تصور کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کے اندر اپنی اسلامی توریت کا احساس پیدا نہ کر دیا ہوتا تو آج اس پاکستان کا کہیں وجود نہ ہوتا ۔۔۔

آج اگر بندستان میں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تہذیبی وجود پر اصرار کر رہے ہیں تو وہ بھی اسی تعلیم کی وجہ سے کر رہے ہیں جو اقبال نے اس وقت یہی تھی اور یہ پاکستان بھی اسی تعلیم کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا جس نے مسلمانوں میں یا

اس احساس کو بیدار کر دیا کہ وہ ایک توم اور ایک ملت میں۔

دین و سیاست کے متعلق باطل تصور کی بیخ کرنی

اقبال نے ایک بڑا کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ دین اور سیاست کی علیحدگی اور دین دنیا کی تفرقی کا جو تصور مغرب سے آ کر مسلمانوں میں پھیل رہا تھا اور حس کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگئے تھے کہ اہل دین کو سیاست سے کیا تعلق اور دین کو سیاست میں گھسینے کا کیا کام۔ اقبال نے اس باطل تصور کا ٹھیک وقت پر مقابلہ کیا۔ اس نے دین بے سیاست کی بھی بر ملا نہ ملت کی اور سیاست بے دین کو بھی علاویہ نہ موم فراہیا سیاست بے دین کے متعلق اقبال کا ایک مصرع ایسا ہے کہ اس موضوع پر تمام دین کا لڑیجہ ایک طرف اور وہ مصرع ایک طرف — ان کا کہنا ہے کہ

جدا ہو دین سیاست سے تورہ جاتی ہے چنگزی

اگر آپ اس موضوع پر دنیا بھر کی کتابیں پڑھوالیں تو آپ وکیلیں گے کو اس نظر میں ان سب کا خلاصہ اور عطف نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال نے ان الفاظ سے دراصل یہ بات ذہن نشین کی ہے کہ جب تم سیاست کو دین سے الگ کرتے ہو تو اس کا نتیجہ سوانح و حشت و بربریت اور ظلم و ستم کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ سیاست صرف اسی صورت میں ٹھیک رہ سکتی ہے جبکہ دین اس کو صحیح راستے پر قائم رکھنے کے لیے ایک رہنماؤت کی حیثیت سے اس کے ساتھ موجود ہو۔

اسی طرح سے مسلمانوں کے دماغوں میں جو یہ خیال جاگز این ہو جاتا تھا کہ اہل دین کا کام تو میں اللہ اللہ کرنا ہے یا مسجد روی اور مدرسیں میں فقط قرآن و حدیث پڑھنا ہے، ان کا سیاست سے بھلا کیا تعلق — اس غلط تصور پر چمی اقبال نے ایک کاری ضرب لگائی ہے اور اس کو بھی ایک مصرع میں بیان کر دیا اور واقعہ یہ ہے

کہ اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا جا سکتا ہے وہ سب ایک طرف اور دوسرے ایک طرف
— اقبال کہتا ہے کہ :

ع عصانہ ہو تو کلیمی ہے کا ربے بنیاد

اس ایک مصريع میں یہ سب حقیقت کھوں دی گئی ہے کہ اگر دین کے پاس
پانے عقیدے اور نظام کو نافذ کرنے کے لیے طاقت نہیں ہے تو طاقت جس شخص یا کوئی
یا نظام کے پاس ہے وہ دنیا کو اپنے راستے پر ہانک کر لے جائے گا۔ آپ کے لیے
کلیمی کرنے کا کیا موقع باقی رہے گا اور وہ کلیمی کہاں بروئے عمل آئے گی۔

اقبال نے پرے زور کے ساتھ یہ بات بھی لوگوں کے ذہن نشین کی کہ موجود
زمانے کے ازم انسانیت کے دکھوں کا مدارا نہیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے
میں جتنا ظلم و تسم، فساد و غارت گرمی اور انسانیت کے لیے آلام و مصائب رونما ہو
ہیں وہ سب انہی ازموں کا کیا دھرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جس طرح ان ازوں
میں سے سرمایہ داری کی مذمت کی ہے اسی طرح سے اس نے اشتراکیت کی بھی مذمت
کی ہے۔ ان کا آخری پیغام جوانوں نے اپنی دفاتر سے دو دعاٹی مہینے پہلے آں دیا
رٹیڈیو سے دیا تھا اور غالباً ان کو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہ آخری پیغام دنیا کو دے رہے
ہیں۔ اس میں انہوں نے بالکل وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اس وقت انسانیت
جن مصائب میں گرفتار ہے اور جس ہلاکت و تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے وہ سب
ان ازموں کی وجہ سے ہے۔ ان کے اس پیغام پمشکل سے دو سال گزرے تھے
کہ وہ تباہی جنگ دوم کی صورت میں دنیا پر مسلط ہوتی اور اس کے بعد بھی اس کا خطہ
مستقل طور پر موجود ہے۔ انہوں نے وضاحت کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ انسانوں کے
یہ خود تراشیدہ مادران ازم ہی دراصل انسان کے مصائب کا سرچشمہ ہیں اور انہی
ازموں نے اس وقت انسانیت کو مصیبت عظیٰ میں مبتلا کیا ہے اور اس کے لیے

تابہی اور ہلاکت کی راہ میں ہماری کی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس پیغام میں اشتراکیت، سرمایہ داری، ملکیت، امریت، نازیت، فسطانتیت سمجھی کی مدت بھی لکھئے اور انہیں انسانیت کے لیے ملک قرار دیا ہے۔

اس کے ساتھ اقبال نے مثبت طور پر یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشینی کی ہے کہ تمہاری مصیبتوں اور مسائل کا اگر کوئی حل ہے، تو وہ صرف یہ ہے کہ تم قرآن کی پسیروں کی وادا پنی زندگیوں پر اسلام کے آئین کو نافذ کرو۔ انہوں نے، ۱۹۳۰ء میں قائدِ عظیمؐ کے نام جو خط لکھا تھا اس میں واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا کوئی حل ہے تو وہ صرف اسلامی آئین کے نفاذ میں مضمون ہے۔

یہ وہ کارنامہ تھا جو اقبال نے اپنی زندگی میں انجام دیا۔ اب اس کے مقابلے میں اس ایڈم کی حقیقت دیکھئی ہے کہ اقبال خدا نجاستہ سو شلسٹ تھے۔

کسی آدمی کی فکر اور اس کے نقطہ نظر کو جانچنے کے لیے اس کی کسی بھارت سے کوئی ایک آدھ فقرہ سیاق و سبق سے اگر نکال کر اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص بحیثیت مجموعی کس نظام فکر کے لیے برسوں کام کرتا رہا۔ کس خیال اور نظر یہ کہ کوئی زندگی بھر لوگوں کے ذہن نشین کرتا رہا اور فی الجملہ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ اس لحاظ سے اگر اقبال کے ساتھے کام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اسلام کا داعی تھا کسی دوسرے کے نظر یہ اور نظام کا داعی تھا۔ وہ اس بات کا ہرگز قابل نہیں تھا کہ اسلام کے سوا کسی چیز کو یا اسلام کے ساتھ کسی چیز کو اختیار کر کے ہماری نجات ہو سکتی ہے۔ اب یہ ایک عجیب لطفیہ ہے کہ جن لوگوں نے اقبال کی زندگی میں اس کے اس کام کی وجہ سے اسے رجعت پسند قرار دیا تھا اور اس بناء پر قرار دیا تھا کہ یہ شخص ایک صدیوں پرانے نظام کی طرف لوگوں کو بلارہا ہے اور اس کی بیانیاتی لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج وہی لوگ

اس کی وفات کے بعد کہ رہے ہیں کہ وہ اسلام کا نہیں بلکہ سو شلزم یا اسلامی سو شلزم کا قائل تھا۔ یعنی پہلے اس شخص کو جب کہ اس کے اصل خیالات سامنے آئے اس بنا پر یجutt پسند قرار دیا کہ اس کے دلائل و نظریات کا توڑ کرنا ان کے اب میں نہیں تھا اور جس نظر ہے اور نظام کی طرف وہ ان کو بلا رہا تھا اس کے یہ لوگ دشمن تھے لیکن اس کے بعد جب دیکھا کہ اس شخص کی گرفت (۵۷۰ھ) تعلیم یافہ مجھے کے ماغول پر بہت منفی و طہری ہلکی ہے اور اس کی فکر قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے اس لیے اب اس کی مذمت نہیں کی جاسکتی تو انہوں نے کہا کہ اچھا اگر اس کو (CONDEM) نہیں کر سکتے تو اس کو (VERAT) کرو اور کہو کہ وہ تو سو شلزم کا قائل تھا اور یہ سو شلزم بھی اقبال کے کلام سے برآمد کس طرح کیا جاتا ہے ذرا ایک نظر سے بھی دیکھ جائے۔

ان کا مشہور شعر ہے کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر ہو رہی

اس کھیت کے ہر خوشہ کندم کو جلا دو

اول تو آپ یہ دیکھیں کہ جس سلسلہ کلام میں انہوں نے یہ بات فرمائی ہے اس کے اندر اس شعر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اے اشتراکی گوریلو احمد اور لوگوں کے کھیتوں کو جلا دو۔ سلسلہ کلام یہ تھا "اللہ تعالیٰ اپنے ذشتوں سے فرمائے کہ دنیا میں جو ظلم و ستم برپا ہے یہ بھائے عذاب کو دعوت دے رہا ہے اور اگر لوگوں کے ربیان انصاف قائم نہ کیا گیں یہ ترمیمیں یہ اجازت بلکہ حکم ہے کہ ان سب کھیتوں کو جلا دو جن سے دہقاں کو روزی میسر نہیں آتی۔ گویا یہ فرمان آدمیوں کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ بات شاعر کے تجھیل کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذشتوں سے کہی تھی۔

لیکن فرض کیجئے اگر سلسلہ کلام سے صرف نظر بھی کر لیا جاتے جب بھی شعر کا

یہ غرور اخذ کرنا صحیح نہیں۔ ایک شاعر کسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے جب کسی بات پر زور دیتا ہے تو وہ مبالغے کی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ سخن فہمی سے آدمی کی محرومی کی علامت ہے کہ وہ شاعر کے کسی شعر کو مفہج کافی صد سمجھ جائیجے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ غالب نے کہا تھا:

تمِ سلامتِ رہو ہزار برس!

ہر برس کے ہولِ دن پچاس سو ہزار

اب کیا واقعی غالب کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ اس کا مدد و حکم کو روں سال زندہ رہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے پیشِ نظر یہ چیز نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد اس کے حق میں درازی عمر کی دعا کرتا تھا۔ اس بات کو ادا کرنے کے لیے اس نے مبالغے کی زبان استعمال کی اور مبالغہ شعر میں حسن پیدا کرتا ہے۔ اگر اقبال اس موضوع پر تقریر کرتے کہ لوگوں کے اندر بے انسانی پائی جاتی ہے اور ان کے حقوق پامال کیے جائے ہیں اس لیے اس ظلم اور بے انسانی کا ازالہ ہونا چاہیئے تو وہ کہہ اس مقصد کے لیے لوگوں کو یہ فرماتے کہ جاؤ اور جا کر کھیتوں کے ہر خوشہ گذیم کو جلا دو اور ہالفر من اگر کوئی شخص جاگران سے کھیتوں کو جلانے کی اجازت مانگتا تو وہ کہہ اس کی اجازت یا حکم نہ دیتے۔ شعر کی زبان میں یہ بات سمجھانے کے لیے کہ جہاں فی الواقع لوگوں کے ساتھ انصاف نہ ہو رہا ہو وہاں لوگوں کو سبق سکھانے اور منزدینے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مبالغے کی زبان اور شاعر اور طرزِ ادا سے کام فروٹے کیا لیکن یہ کسی مضتی یا تماضی کا فیصلہ نہیں تھا۔

اقبال اور عدل اجتماعی

اسی طرح اگر اقبال نے کبھی اپنی کسی تحریر میں اسلامی سو شلزم کا فقط استعمال کیا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اقبال نے اسلامی سو شلزم کا کوئی فلسفہ ایجاد کیا

تھا اور اپنی ساری عمر وہ اس فلسفے کی تبلیغ کرتے ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ آگے جل کر بعض خاص لوگ کسی لفظ کو کیا میں پہنانے والے ہیں۔ اس وقت اقبال نے جوابت کہی تھی ودیہ تھی کہ معاشرتی اور اجتماعی انصاف (SOCIAL JUSTICE) کے لیے کسی سو شلزم کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ اسلام میں بھی تو موجود ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلام ہی میں موجود ہے۔ اس غرض کے لیے اگر کسی وقت انہوں نے یہ لفظ استعمال کر بھی لیا جیسا کہ قائدِ اعظم نے بھی کبھی یہ لفظ استعمال کر لیا ہو گا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ ان کا کوئی مستقل فلسفہ یا نظریہ تھا۔ آدمی کا فلسفہ یا نظریہ وہ ہوتا ہے جس کی تبلیغ و تلقین اور اس کی تشریح و تونیخ میں وہ اپنی توانی کھپاتا ہے۔ اقبال نے تبلیغ میں تو اپنی ساری قوتیں اسلام کے لیے کھپائیں اور سارا زور لوگوں کو اس بات کی طرف بلانے کے لیے صرف کیا کہ تم اسلام کے فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات کو اختیار کرو۔ لیکن اگر انہوں کو اس کی طرف یہ بات منسوب کر لی جائے کہ وہ سو شلزم کا قابل تھا تو اس سے زیادہ بے انصافی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ اگر اقبال اسلامی سو شلزم کے قابل ہوتے تو اس کے اصول اور لفایل بیان کرتے اور بتاتے کہ اس سے ان کی مراد کیا ہے اور پھر لوگوں کو اس کی تبلیغ و تلقین بھی کرتے مگر اس بات کا سہے سے کوئی وجود ہری نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا کیا ہو۔ اس لیے یہ ایک مترجع علمی مدد بیانی (INTELECTUAL DISHONESTY) ہے کہ کوئی آدمی کسی صاحب نکار کی طرف ایک نظریہ منسوب کر دے سجدہ حقیقت اس کاہے نہیں۔

سو شلزم یا کسی دوسرے غیر اسلامی نظریہ و مکر کے بغیر اقبال نے تو بڑی دضاحت اور تکمیل کے ساتھ مسلمانوں کو یہ تصور دیا کہ محض سیاسی آزادی یا اقتصادی بہبود ہی برا

مقصود نہیں ہے بلکہ اسلام کی خانہت تھا اصل مقصد ہے۔ اس نے بار بار یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی تھی کہ ہمارا عقیدہ، ہماری تہذیب، ہماری روایات اور ہماری اخلاقی اقدار سی ہمارے لیے اصل چیزیں ہیں۔ محسن روٹی یا زمین کا لندن اکوئی الیسی چیز نہیں ہے جسے لیے ایک مسلمان جھٹے یا مرے۔ اقبال نے واضح طور پر یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کو ایک وطن صرف اس لیے چاہیئے کہ وہ وہاں اسلام کے اصولوں پر زندگی بسر کر سکیں۔ ان کی ۱۹۳۰ء کی تقریب سے جس میں انہوں نے پاکستان کی اصطلاح استعمال کیتے بغیر پاکستان کا تخلیل پیش کیا تھا، یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نظر میں اگر کوئی چیز را ہم تھی تو صرت یہ کہ کسی طرح اسلام اور اہل اسلام کو سر بلندی نصیب ہو دے یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہ کر مسلمان اپنی تہذیب پر قائم نہیں رہ سکتے اس لیے انہوں نے صرف مسلمانوں کی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے ایک اگک اور آزاد مملکت کے حوصل کا تصور پیش کیا۔ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد محسن کسی ایسے لفظ یا اصطلاح کی بنیاد پر چونہ انہوں نے اتفاقاً کسی موقع پر کسی دوسرے سیاق و سبق (CONTEXT) میں کسی دوسرے مفہوم میں استعمال کی ہوا، اس کی طرف کسی خاص نظر پر کو منسوب کرنا نا صریح بد دیانتی بھی ہے اور مسلمانوں کو دھوکا اور فریب دینا بھی ہے۔

آخری بات

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال اور تاذ اعظم آپ کو اسلام کی بنیاد پر ایک وطن دے کر گئے ہیں۔ اقبال نے آپ کو فکار اور نظریہ دیا اور تاذ اعظم کی قیادت میں آپ کو یہ وطن حاصل ہوا۔ اس وطن کی انوکھی شان یہ ہے کہ اس کا نظریہ پہلے وجود میں آیا اور ملک بعد میں بنا۔ اگر اس ملک کے بنیاد میں

نظریے کو یاد سے لفظوں میں اس کی نظریاتی بنیاد کو ہٹا دیا جاتے تو یہ ملک قائم نہیں رہ سکتا۔ آج اس ملک کی نظریاتی بنیاد پر مختلف اطراف سے حملہ کیے جا رہے ہیں لیکن کیا آپ اس چیز کو جو اتنی محنتوں اور عذیم قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہوتی یونہی اپنی غفلت اور کوتاه ہمتی سے مناطع کر دیں گے۔ ہمیں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے اس کو کھو دیا تو گویا تاریخ انسانی میں یہ بات ثابت کر دیں گے کہ ایک بیوقت قوم تھی جس نے لاکھوں جانوں، ان گنت عصموں اور کروڑوں اور اربوں روپیں کی جائیدادیں قربان کر کے ایک ولمن حاصل کیا، مگر ولمن حاصل کرنے کے بعد ۲۳ برس کی دست کے اندر ہی اندر اس کو کھو بھی دیا۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا تو تاریخ میں آپ کا مقام ایک بے وقوف اور ایک اجمیٰ قوم کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا (اب شریعت) آپ کی تاریخ کو باقی رہنے دیا گیا، اگر آج آپ نے اشتراکیت یا رعنی قویت کے نظریے یا کسی اور باطل ازم کو اختیار کیا تو صرت یہی نہیں کہ آپ کی آزادی ختم ہو جائی بلکہ میں کہتا ہوں کہ آپ کا وجد بھی ختم ہو جائے گا اوس مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اپسین کے بعد تاریخ کا یہ دوسرا جیانیکالیہ ہو گا کہ اس برصغیر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس وجہ سے یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کے نوجوان، مرد اور عورتیں اب بچے اور بڑھے سب اس بات کے لیے متعدد ہو جائیں کہ وہ یہاں اسلام کا نظام ہی غالب کریں گے اور ان لوگوں کی کوششوں کو قطعی طور پر ناکام بنادیں گے جو مسلمانوں کو اسلام کے عقیدے اور نظامِ حق سے منحرف کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح ان کو فتنوں میں مبتلا کر کے تباہی کی طرف دھکیلانا چاہتے ہیں۔

(خطاب مبورق یومِ اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۴۰ء)

پنجاب یونیورسٹی ہال۔ لاہور

حیاتِ اقبال کا بمعنی

دنیا کا میلان ابتدائے جدید ترین دوڑتک اکابر پرستی
HERO WORSHIP

کی جانب رہا ہے۔ ہر بڑی چیز کو دیکھ کر ہذار نبی ہذا اکابر کہنے کی عادت، جس کا نامور قدم ترین انسانوں سے ہوا تھا۔ آج تک اس سے نہیں چھوٹی ہے جس طرح دوہزار برس پہلے بدھ کی عظمت کا اعتراض اس مخلوق کے نزدیک بجز اس کے اور کسی صورت سے نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا ایک مجسرہ بن کر اس کی عبادت کی جائے۔ اسی طرح آج بیسویں صدی میں دنیا کی سب سے زیادہ سخت منکر عبودیت قوم (روس) کا ذہن یعنی کی بزرگی کے اعتراف کی کوئی صورت اس کے سوانحیں سوچ سکتا کہ اس کی شخصیت کے آگے مراسم عبودیت بجا لائیں۔

یکن مسلمانوں کا نقطہ نظر اس باب میں عام انسانوں سے مختلف ہے اکابر پرستہ کا تصور اس کے ذہن کی افتاد سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ وہ بڑوں کے ساتھ رہتا و کرنے کی صرف ایک ہی صورت سوچ سکتا ہے۔ یعنی **اولئے اللہین هدا هم** اللہ فبهد احمد اقتدہ اللہ نے ان کو زندگی کا سیدھا راستہ بتایا تھا جس پر چل کر وہ بزرگی کے مراتب تک پہنچے۔ لہذا ان کی زندگی سے سبق حاصل کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ اسی نقطہ نظر سے میں اس مختصر سے مضمون میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جس اقبال کی عظمت کا سکھانے کے دلوں پر بلیٹھا ہو اے۔ اس کی

زندگی کیا سبق دیتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اقبال نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی میںیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی ادب، یہی اقتصادیات، یہی سیاست یہی قانون اور یہی فلسفہ انہوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنوں میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتهی فارغ التحصیل تھے خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلسفہ تک کرچکے ہیں۔ جس شراب کے دوچار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہلنے لگتے ہیں، یہ مرحوم اس کے سند رپے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کر بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے ۹۹ فیصدی نوجوان دیکھتے ہیں، بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر اتر چکا تھا اور ان سب مخلوقوں سے گزر رہا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین ایمان لپنے اصول تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا کیا حال تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سند میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجد ہمارے میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے اگر اس کا کوئی فکر ہے وجد باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علماء دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا۔ حوفاظت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اور اس ایم اے پی ایچ ڈی، بار ایٹ لائے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری نور میں اقبال نے تمام کتابوں کو انگ کر دیا تھا اور رسول اللہ قرآن کے اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے، وہ یہ تھا کہ اصل مسلم قرآن ہے اور یہ جس کے ہاتھ آجائے وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند سوالات پیش کیے اور ان کا جواب مانگا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماریاں کھلوٹیں گے اور بڑی بڑی کتابیں نکلو اکران مسائل کا حل تلاش کریں گے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لائبریری کی الماریاں متفقہ کی متفقہ رہیں اور وہ صرف قرآن ہاتھ میں نے کر جواب لکھوانے بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بارک کے ساتھ ان کی دالیاں عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر کسی کو یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے ساتھ تفاسیر اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی کے تدوین پر ایک متابع حقیر کی طرح تذکر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یا نتیہ نہیں پہنچنے مولوی بیک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل کرتا ملیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر افت نلاسی ان کے ٹھیکھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شد کا گزرنہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب مثلاً“ کے ساتھ کوہ احمد پر شریعت رکھتے تھے۔ اتنے میں احمد لرزنے لگا جو حضور نے فرمایا کہ ٹھہر جا۔ تیرے اور پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شمیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے اس پر پھاڑ ساکن ہو گیا۔ اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچھے کی کوئی سی بات ہے میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں باطل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس

کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آ کر مانے کے بڑے سے بڑے تو وے بھی لرز جاتے ہیں۔ مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور پیغمبر ﷺ تو انہیں سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خجالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں ان کی تائید کرنا ایک تعلیم یا نہاد آدمی کے لیے ڈوب مرنے سے زیادہ بد ہے۔ اقبال نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا ہے بلکہ بر ملا ان کی حایت کرتا تھا اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔ اس کی ایک معمولی مثال سن لجھئے۔ ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقیہ میں اپنا ایک بینٹ بن کر جیجنے چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا گیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں اور رکاری تقریبات میں لیدھی اقبال کو ساتھ لے کر شرک ہو اکریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور خود لارڈ ولنگڈن سے کہا کہ میں شکر ایک گزار گھار آدمی ہوں۔ احکام شریعت کی پابندی میں بہت کوتا ہیاں مجھ سے ہوتی ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کے حکم کو توڑ دوں۔

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے۔ عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خدا ان کی افتاب طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے۔ جن کی بنابر اپنی رندی کے اشتہار میں میں انہیں کچھ مزا آتا تھا درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔ ترآن محمد کی تلاوت سے ان کو خاص شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحافی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے مگر انہیز مانے میں طبیعت کی رفت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کئے دراں

میں رفتے رہتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھری نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع و خضور سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ میں نہ اگفار کا غازی ہوں۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیر از طبیعت کے حالت ان کی مفات کے بعد ہر لوگوں میں شائع ہرئے درنہ عالم خیال یہی تھا کہ جیسے اور سر صاحبان ہوتے ہیں ویسے ہی وہ بھی ہوں گے۔ اور اسی بناء پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ دالا تھا۔ کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کیا ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ نقیر نہیں تھا۔ جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بات کیا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجئے جس سے اس نائب اور بیر سٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مندر میں نے ایک تانوفی مشورہ کے لیے اقبال اور سرفصل حسین مرحوم اور ایک دو اور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلا یا۔ اور اپنی شان دار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف علیش رشم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قمیتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جتوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اس نے بوئے پرسوسو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ انسوؤں کی جھٹڑی بندھ گئی۔ اس بستر پلیندا ان کے ناممکن ہو گیا۔ اور بہادر کے غسلخانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رہنا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چار پانچ اس غسل خانے میں بچھوا تی اور جب تک دہان مقیم ہے، غسل خانہ ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی بس پہلے کا واقعہ ہے۔ جب باہم کی دہان کو سوت دوٹ میں دیکھا۔ کرقی تھی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوت کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے۔ اس کی اہلی

شخصیت کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا استھان رکھتے ہیں اور سو شکست بن کر غریبوں کی بہادری کا دم بھرتے ہیں مگر پہلے نکاہوں سے بہت کر ان کی نام زندگی رہیسا نہ اور عیش پسندانہ ہے۔

اقبال کے نائیٹ ہڈ اور سر شفیع مرحوم جیسے حضرات کے ساتھ ان کے سیاسی رسنہ کو دیکھ کر عام یہ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ وہ محض شاعری ہی میں آزاد خیال تھے عملی زندگی میں آزاد خیالی ان کو جھپوکر بھی زگزگی بکد وہ نزے انگریز کے خلاف تھے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے قریب جو لوگ رہے ہیں اور جن کو گھر سے ربط و نسبت کی بناء پر ان کی اندر و فی زندگی اور ان کے اندر و فی خیالات کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ انگریزی سیاست سے ان کو خیال اور عمل دونوں میں سخت نفرت تھی۔ بارگاہ حکومت سے وہ کو سوں دور بجا گئے تھے۔ سرکار اور اس کے پرستا۔ دونوں ان سے سخت بدگمان تھے اور ان کی ذات کو اپنے مقاصد میں حارج سمجھتے تھے بیات میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا بلکہ وہ آزاد ہندوستان میں "دارالاسلام" کو اپنا مقصد حقیقی بنائے ہوئے تھے۔ اس لیے کسی الیسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے جو ایک دارالکفر کو دوسرے دارالکفر میں تبدیل کرنے والی ہو۔ صرف یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عملی سیاست میں ان لوگوں کے ساتھ مجبوراً نہ تعادن کیا جو بُرش گورنمنٹ کے زیر سایہ ہندوراج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے کہ مقاصد کے اعتبار سے ان میں اور اس طبقہ میں کوئی ربط نہ تھا مگر صرف اس مصلحت نے ان کو اس طبقہ کے تھے جوڑ رکھا تھا کہ جب تک مسلمان نوجوانوں میں "دارالاسلام" کا نصب العین ایک آتش فرداں کی طرح بھڑک نہ ٹھے اور وہ اس کے لیے سرفرازانہ جدوجہد پر آمادہ نہ ہو، اس وقت تک کم از کم انقلاب کے رخ کو بالکل دوسرا جانب پہنچ جانے سے روکے رکھا جائے۔ اس بناء پر انہوں نے ایک طرف اپنی شاعری سے نوجوان اسلام

کے دلوں میں وہ روح پھونکنے کی کوشش کی جس سے سب لوگ واقعہ میں اور ذریعہ طرف عملی سیاست میں وہ روشن اختیار کی جس کے اصل مقصد سے چند خاص آدمیوں کے سوا کوئی واقعہ نہیں اور جس کے بعض ناہری پہلوؤں کی وجہ سے وہ خود اپنے بہترین عقیدت مند معترضین تک کے لفظ سنتے ہے۔

اسٹوڈیس میگزین — جوہر — اقبال نمبر
جامعہ طیبہ بیونیورسٹی دہلی - ۱۹۳۸

کتابی لیالی ص ۲۲۳ - ۲۲۴

جوہر، شمارہ جمیع مصائب، ۱۹۳۸ء، ص ۲۲۳
سلسلہ حادثہ حمایۃ - اشاعت دہم
ماہ جنور ۱۹۳۰ء، ص ۲۸۵

اقبال - محمد ساز شخصیت

(ماہنامہ "سیارہ" لاہور کے اقبال نمبر میں علامہ مرحوم سے متعلق مولانا محترم
کا یہ معلومات افز انٹرویو شائع ہوا)

سیارہ: "مولانا آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اقبال میرا روحانی سہارا تھا۔۔۔ اس کے پس منتظر میں کیا الیہ کار فرمائے؟"

مولانا: "ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے پہمان کوٹ میں آنے کو لکھا تھا اور مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تم اس جگہ آ کر بیٹھ جاؤ۔ تو میں بھی سال میں چھ بیسینے دہائی گزارا کروں گا۔۔۔ میں ایک ایسی جاذبیت نئی جس کی وجہ سے میں نے فوراً ہی اس تجویز کو قبول کر لیا اور جید رآباد سے پہمان کوٹ چلا آیا۔ مگر اس ساری داستان کا الیہ یہ ہے کہ مالحق میں میں پہمان کوٹ منتقل ہوا اور اپریل میں ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت مجھ پاس حادثہ کا شدید اثر تھا، اسی حساس نئے مجھے یہ انداز لکھنے پر مجبور کیا۔"

سیارہ: "مولانا آپ کے اور علامہ اقبال کے درمیان جو مراسلات یا گفتگو ہوئی اسے اگر تفصیلًا بتا دیں تو مفید ہو گا۔"

مولانا: "وہ خطوط تو میرے کر پا س نہیں ہیں۔ لیکن دوسری تفصیلات بتائے دیتا ہوں: مولانا نے اپنے مخصوص دستی سے دستی سے انداز میں یہ کہنا شروع کیا:

چودھری نیازعلی صاحب نے دین کی خدمت کے پیش نظر ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے زمین و قوت کی اور عمارت بنانی شروع کیں۔ لیکن ان کے سامنے یہ متعین تھا کہ ادارہ کس قسم کا ہو۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ کس قسم کا ادارہ قائم کیا جانا چاہیئے۔ میں نے ایک خاکہ لکھ کر بھیجا جوان خطوط پر تھا جو بعد میں میں نے دارالاسلام کے بارے میں شائع کیا۔

اسی دوران میں انہوں نے علامہ صاحب سے بھی رہنمائی کی غرض سے خط و کتابت کی۔ اس خط و کتابت کی تفصیلات مجھے معلوم نہیں ہیں۔ البتہ یہ مجھے چودھری نیازعلی صاحب سے معلوم ہوا کہ میری تجویز کردہ اسکے لیے انہوں نے علامہ مرحوم کو دلکھائی تھی اور انہوں نے اسے پسند کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس وقت کرنے کے لیے کام ہیں۔ اس سلسلہ کی ساری خط و کتابت چودھری نیازعلی صاحب کے پاس محفوظ ہے اور ان سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ بلکہ وہ غالباً ایک دفعہ شائع کر چکے ہیں۔ تقریباً ۱۹۳۶ء ہی کا زمانہ تھا جب پہلی مرتبہ علامہ صاحب لے مجھے نزدیک نیازی صاحب یا میاں شفیع صاحب کے ہاتھ سے خط لکھوا یا تھا کہ میں حیدر آباد سچوڑ کر پنجاب میں منتقل ہو جاؤں مگر اس وقت میں نے اطمینان مدد رکھ دیا تھا، کیونکہ اس وقت میں حیدر آباد ہی میں ہٹنے کا خیال رکھتا تھا اور وہاں میں نے زمین بھی اس غرض سے خریدی تھی کہ اس طرح کام ایک ادارہ قائم کروں گا۔ جس کی تجویز انہوں نے کی تھی۔

سیارہ: علامہ صاحب نے آپ کو پنجاب آجائے کے لیے کوئی خاص وجہ بھی لکھی تھی؟
مولانا: ”بس یخواہش ظاہر کی تھی کہ میں پنجاب چلا آؤں، زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کی مصلحت کیا ہے البتہ ۱۹۳۰ء کے وسط تک پنج کر میجھے یخواہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند کو سچوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رخ کرنا چاہیئے اسی زمانہ میں چودھری نیازعلی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے

اس مقام کو دیکھیے جو جوانوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے وقف کیا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ شمالی ہند کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کروں، جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے۔ اسی خیال سے میں نے شاید اگست کا آخر تھا۔ ۳۰ میں پنجاب کا سفر کیا اور جاندہ اور لاہور سے بہت اہم اپٹھان کوٹ پہنچا۔ اسی سفر میں علامہ اقبال مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ چودھری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے، میں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم کروں، جس کا خاکہ میں نے چودھری صاحب کے نام پہنچا۔

سیارہ: "آپ کا شمالی ہند کو مرکز بنانے کا ارادہ کیوں ہوا؟"

مولانا: "میں نے یہ محسوس کیا کہ جنوبی ہند میں کام کرنے کے موقع روز بروز کم ڈلتے جاتے ہیں اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے سنت قبل کا فیصلہ بڑی حد تک شمالی ہند میں ہوا۔" سیارہ: "آپ کی اور علامہ اقبال مرحوم کی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس میں کون سے سائل زیادہ زیر بحث رہے؟"

مولانا: اس وقت بزرگستان ہوتی، وہ یہی بقیہ رہنماءوں کے لیے کس نوعیت کے تعریفی کام کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں میرے اور مرحوم کے خیالات قریب تریب یکساں تھے۔ اور کام کا وہی نہ کہ ان کے پیش نظر تھا، جو میں نے پیش کیا اسی کو عملی جامہ پہنانے کی تدبیر ہی تھی۔ اس گفتگو میں سوچتے رہے تفصیلات مجھے یاد نہیں رہیں۔"

سیارہ: "کیا اس وقت یہ چیز پیش نظر تھی کہ ہندوستان میں ایک اسلامی تحریک چلا جائے؟"

مولانا: اس وقت تحریک پیش نظر تھی۔ اس وقت وہ چیزیں پیش نظر تھیں۔ ایک یہ علمی حیثیت سے ان گوشوں کو پڑ کیا جائے جن کے خالی ہونے کی وجہ سے اسلامی نظام زگی موجودہ زمانے کے لوگوں کو ناقابل عمل نظر آ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگ تباہ کیے جائیں جو مسلمانوں کی فکری اور عملی رہنمائی کرنے کے تابع ہوں۔ ایک خاص اور

جامع اسلامی تحریک کا تختیل اس وقت واضح طور پر سامنے نہیں آتا۔

سیارہ: علامہ اقبال اس وقت علمی میدان میں کون سے کاموں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے؟

مولانا: زیادہ تفصیل یاد نہیں۔ اسلامی قانون اور فلسفہ کی مدد میں ان کے پیش نظر تھی۔

اس وقت جو بات ہوئی یہی تھی۔

سیارہ: مولانا! سنائے کہ علامہ اقبال "ترجمان القرآن" کا خاص طور پر مطالعہ کیا کرتے تھے۔

مولانا: مجھے بعد میں نذر نیازی صاحب اور میاں شفیع صاحب سے معلوم ہوا کہ علامہ مرحوم "ترجمان القرآن" بڑے غور سے پڑھتے تھے اور "الجہاد فی الاسلام" پڑھوا کر سنی تھی اور یہ پسند کیا تھا۔

سیارہ: مولانا! اسلامی نقطہ نظر سے اقبال کو کوئی چیز عزلت نہیں تھی ہے؟

مولانا: اس وقت حقیقت میں ایک یہی انسان کی ضرورت تھی جو مغربی تعلیم پر فخر کرنے والے عام لوگوں سے زیادہ تعلیم پائے ہوئے ہو۔ اور ان سے بڑھ کر ہی مغربی علوم پر نگاہ کھتنا ہو۔ اور پھر وہ اس پُر زور طریقے سے اسلامی نظریات کی تائید کرے کہ مغرب زدہ لوگ اس کے سامنے بولنے کی بہت نہ کر سکیں، علامہ اقبال "کامل

CONTRIBUTION

یرہے کہ اس وقت جو معرفتی علوم و فنون کا رعب تھا اور ایک عام تصور تھا کہ خالص

اسلام اس زمانے میں نہیں چل سکتا۔ مغربی تمذیبے

کرنا ضروری ہے اور اسلامی نظریات کو مغربی نظریات میں ڈھالا جائے۔ اس تصور کو اقبال نے توڑا۔ اس لحاظ سے اس وقت اسلامی تحریک کے لیے اقبال کی شخصیت اہم سہارا تھی۔ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص ان کی تمام آراء سے آفاق کرے بلکہ نیشنیت

نجمو عنی انہوں نے جو خدمت اپنے نہیں دی، وہ بہت اہم اور قابل قدر ہے۔

سیارہ: مولانا! اقبال کی عملی زندگی، ان کے آئیڈیل کے مطابق نہ تھی؟

مولانا: آپ ان کی خوبیوں کو بنانے کی کوشش کریں اور

EXAMPLE

ان کی عملی کمزوریوں سے صرف نظر۔

ستارہ: "مولانا! بعض اوقات اقبال کے کئی نظریات الجھے ہوتے محسوس ہوتے ہیں؟"

مولانا: "بھائی، ایک شاعر کو غیر شاعر کی حیثیت سے دیکھنا، اس پر سب سے بڑا ظلم ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کو بھی اس نگاہ سے دیکھنا ظلم ہی ہو گا۔ آپ ان کی خوبیوں کو باشناظر رکھیں جو آپ اور پوری قوم کے لیے مفید ہیں۔"

(ماہنامہ سیارہ اقبال نمبر)

مئی ۱۹۶۳ء

حسن انہر (حسن احمد) (انگریز مولانا مسعودی) (۱۹۲۵ء)

ص (۲۳۲)

کتابخانہ اقبال - صفحہ ۲۳۲

سردِ فتنہ

درج ذیل اثر دیو محترم نعییم مدنیقی صاحب نے ماہنامہ "سیارہ الامور" کے بیانے مولانا سے حاصل کیا جو فروری مارچ ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

ن۔ ص : آپ کے مطالعہ اقبال کا ادھر کہیں مختصر ساز کر پڑھا۔ بات کچھ ترشنا اور نامکمل ہی معلوم
و۔ م : اس وہ کسی طرح آگئی ہے۔ مجھے کچھ علم نہیں۔ اسے پڑھ کر دو ایک پہلوؤں سے خلط
تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔

ن۔ ص : ثابت ہو چکیں جانتا چاہتا ہوں کہ آپ کے دائرہ مطالعہ میں اقبال کی بخارات
تحییں یا نہیں۔

و۔ م : یقیناً! اقبال کی بعض نظریں بچاپن میں یاد کی ہوئی تھیں۔ بہت سی چیزیں خود والد مرحوم
نے یاد رکھیں۔ ان میں مددیں حالی بھی شامل تھی۔ والد مرحوم دبی کالج میں حالی
کے شاگرد بھی ہے تھے۔ آہستہ آہستہ اقبال کی شاعری اور خیالات سے منسوب
پیدا ہوتی گئی۔

ن۔ ص : علام اقبال سے تعلقات کا کس طرح نشووندا ہوا؟
و۔ م : ایک دن علامہ کا خط یکاکیب حیدر آباد میں موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ تم پنجاب
 منتقل ہو جاؤ۔ کیونکہ جنوبی ہند آنے والے تالات کے لحاظ سے ایک محفوظ
 علاوہ نہیں ہے۔ جو کام تم کر رہے ہو اس کے لیے پنجاب میں سیدان ہے۔ اس خط کو

پڑھ کر مجھے بہانہ ازہ ہوا کہ علامہ اقبال مجھے جانتے ہیں لہ۔۔۔

ن۔ ص: قطع کلام معاں! اس سے علامہ کی نگاہِ درین کی۔ سائی کا اندازہ ہتنا ہے، نہ صرف ملک کی تقسیم کے امکان پر ان کی نظر تھی بلکہ اس سے پیدا ہونے والے محشر آفرین حادث کا بھی اندازہ تھا۔ وہ ۱۹۴۳ء میں ۰۳۔۱۹۴۶ء کے خوفی نظر کو دیکھ رہے تھے، خیر تو آپ کچھ مدد مارہے تھے۔

۵۔ م: میں نے سوچا کہ جہاں مسجد شہید گنج کا بھی میشنا چل رہا ہے، کچھ لوگ روپش ہونے کی سوچ رہے ہیں، وہاں چاکر میرے جیسا آدمی کیا کر سکے گا۔ چنانچہ میں نے علامہ مر جو کو لکھا کہ مجھے آپ کی اس رائے سے آتفاق نہیں کہ جنوں ہند کام کرنے کے لیے موزوں علاقے نہیں ہے۔ پھر میں، ۱۹۴۳ء میں دبی گیا اور اس خیال میں تھا کہ سوچ سمجھ کر رائے قائم کروں کہ سمجھ اپنا مستقر بنایا جلتے۔

ن۔ ص: آپ کے جواب خط کے بعد کوئی اور خط بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے

۶۔ م: ہاں آئنے سے قبل بھی درین خط ملے، اور بعد میں بھی۔

ن۔ ص: نہایت تیقی اور ایم خطوط تھے؟

۷۔ م: باقستی سے پتوان کوٹ سے جس عالم میں ہجرت کرنی پڑی اس کی وجہ سے کتاب اور دوسرے کاغذات کے علاوہ، میرے جمع شدہ خطوط کا قیمتی ذخیرہ بھی ضائع ہو گیا۔ متعدد شخصیتوں کے اہم خطوط میرے پاس تھے۔ ایک بھی نہیں بجا۔

ن۔ س: آپ فرم رہے تھے کہ مستقر طے کرنے کا معاملہ آپ کے زیرِ غدر تھا۔

۸۔ م: جو ہاں۔ اسی زمانے میں چوری نیاز علی خار جو دہلی آئئے تھے۔ وہ بھی مجھ سے ملے۔

لہ بلکہ الجہاد فی الہ سلام" تو پڑھیں تو ایک ثبات طفتہ ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں اسلامی نظر نظر سے فرسم کی جنگوں کو جائز رکھا ہے۔ مدفعت جنگ اور مصلحانہ جنگ میرا خیال ہے کہ مصلحانہ جنگ کی اصطلاح "الجہاد فی الہ سلام" سے مانع ہے اور اس کا تصور بھی (ن۔ ص)

اور وہ میرے پنجاب منتقل ہونے کے لیے اصرار کرتے ہے۔ مرحوم کا تھا ضایہ تھا کر
چل کے اس تیاری کو دیکھ تو یہ نجہم کر رہے ہیں۔ اس خیال سے کہ اس جگہ کو بھی دیکھ
لوں اور علامہ اقبال سے بھی مل لوں، میں نے سفر پنجاب کا فیصلہ کر لیا۔ شرقی صاحب
نے جاندھر میں ٹھہرنا کے لیے اصرار کیا۔ وہیں پہلی بار میری ملاقات علامہ علاء الدین
صلی اللہ علیہ مرحوم سے ہوئی۔ جاندھر سے لاہور آ کر میں اقبال سے ملا۔ کچھ دیر گفت گو
رہی۔ بلور خلاصہ یہ بات مجھے یاد ہے کہ علامہ کا مجوزہ پروگرام یہ تھا کہ اسلامی فقہ
کو نئے مرے سے مرتب کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اس
کام کے لیے تم تیار ہو جاؤ تو میں ہر سال چھ ماہ وہاں آتا رہوں گا اور مل کر کام کریں گے
میں نے کہا کہ میری اس سے زیادہ کیا خوش قسمتی ہو گی کہ آپ کے ساتھ کام کروں
یہ میرے لیے اتنی بڑی attraction کشش تھی کہ میں نے

جید آباد سے پنجاب منتقل ہونے کی تیاری شروع کر دی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں منتقل ہوا
اور بھی سامان رکھوا ہی رہا تھا। جس سے فارغ ہوتے ہی علامہ سے ملاقات
کے لیے لاہور جانا تھا، کر ۱۹۴۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ن۔ ص: کیا آپ اقبال کو سمجھنے کے لیے اس کی کسی خاص تحریر یا کتاب کو خصوصی اہمیت
دے کر اس کی سفارش کریں گے؟

۵۔ ۳: شکل یہ ہے کہ اقبال کے یہاں خیالات میں سلسل ارتقاء پایا جاتا ہے۔ مثال کے
طور پر اپنی مشہور کتاب RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT میں وہ ترکی
العقلاب اور مصطفیٰ کمال کی شخصیت کو بہ امثالی تصور کرتے ہیں اور خوب تائید کرتے
ہیں۔ مگر بعد میں جدالات کا تفصیل نقشہ مانے آتا ہے تو ان کی رائے بالکل بدلتی ہے
اقبال کے اصل میں نہیں ذور ہیں۔ آخری اور میرے ذور میں آکر ان کے ذہن اور دل
پر لے کے پورے مسلمان ہو گئے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں

کے اندر الحاد اور مغربی تہذیب سے مرعوب بیت پھیلی ہوئی تھی، اور فخر پر اسلام کا ذائقہ اڑایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اتنی بڑی شخصیت کا مغربی تہذیب کے محااذ سے اسلام کی علمبرداری کے لیے انٹھ کھڑے ہونا بہت اثر انداز ہوا۔ اس دور کے الحاظ سے جتنا مطابع ان کا حبیدیہ فلسفہ و سائنس کا تھا، اس کا اثر نہ صرف یہاں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر پڑا بلکہ مغربی فلسفی بھی ان کے نقطہ نظر کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کیونکہ اقبال اپنی کے علوم سے آراستہ ہو کر ایک نئی راہ فکر پیش کر رہے تھے۔

ت۔ ص : میں نے تمہیدی گفت گو میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کا مطالعہ کرنے کے متعلق سر فراہم طور پر ایک ضمنی سی بات چھیری تھی۔ اس کے متعلق کچھ کہنا پڑت کریں گے۔

ڈ۔ م : الہلال والے ابوالکلامؒ کے متعلق میرا تاثر اس وقت (قریبًاہ اسال کی عمر میں) اسلام کو پوری طرح سمجھنا نہ سکنے کی وجہ سے یہ تھا کہ ان سے زیادہ دین کی سمجھو رکھنے والا کوئی نہیں۔ یہ ذکر ہے الہلال، البلانع اور تذکرہ والے مولانا آزاد کا۔ بعد میں ان کو اچھی طرح پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مولانا کے یہاں بہت سے خلا ہیں اور بہت سی چیزیں اسلامی نظریے کے ساتھ گذرا ہو گئی ہیں۔ بعد میں تمام تر توجہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی طرف ہو گئی۔ وہ جب بھی ملتے بڑی محبت کرتے تھے اور بڑی توجہ سے بات کرنے تھے۔ میری پہلی ملاقات مولانا محمد علی سے بھوپال میں ہوئی۔ ان کے آخری سفر پور پکی تقریباً پہنچنے مقصد و مدعایا اور پُر نور انداز بیان کے الحاظ سے منفرد ہے۔ یعنی اس میں یہ بھر پور جذبہ کہ میں علام ہندوستان میں زندہ والپس نہیں چانا چاہتا بلکہ انگریز قوم کو میری قبر کے لیے دو گز میں بھی یہیں دینی ہو گی۔ کتاب تابعیت کا ایک ناتابل زاریں ہا بہ ہے۔

ن۔ ص : اور مولینا ظفر علی خاں؟

! - م : مولینا ظفر علی خاں بہت قادر الکلام تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا اثر مجھ پر بہت تھا۔
بال، ایک اور دلچسپ بات !

(ا) چانک ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں
نے کوئی بات کی اور بچھڑوٹا ہوا سلد جبڑا)

ہاں وہ دلچسپ باث ایک صاحب کی بیان کردہ یہ روایت ہے کہ مولانا ابرا الکلام آزاد
کے سامنے میرا ذکر چھڑا۔ زمانے لگئے؛ کم جی ہمارا ارادہ تھا اس کام کے کرنے کا، مگر
ہم کسی اور طرف پہنچنے کے لئے اس کے لئے اسی کے ہوئے ہے میں نہیں کہ سکتا
کہ یہ روایت کا ان تک صحیح ہے۔

من اشاعت مارچ ۱۹۷۸
ماہنامہ سیارات ۲۰ نمبر

اس انتروی کا جواہ نسیتا اصال (مطبوعہ ۱۹۷۴ء) میں ہی ہے

شذرات

اقبال کا نظریہ آرٹ

آرٹ سے مقصود کیا ہے؟ اس کے متعلق دور حاضر کے سب سے بڑے باریکات میں
مُبِّعِّد علامہ اقبال تک رائے قابل غور ہے۔ انہوں نے رسالہ "نیوایرا" میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

"جیات، تمام انسانی اعمال کا منتها مقصود ہے انسانی اعمال
کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کی زندگی شاندار، منور اور افزاں ہو جاتے۔
اس لیے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصد غلطی کے ماتحت
رکھا جاتے اور جو شے زندگی کو جس قدر فراہم عطا کرے اسی قدر اعلیٰ و
اشرف خیال کی جاتے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو جہاں سے اندر خفتہ
قوتِ ارادی کو بیدار کر دے نا رہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ۔
مقابلہ کر سکیں۔ وہ تمام طریق و فنون جو خواب اور ہیں، جو ہمیں گرد و پیش کے
ان حقائق سے غافل کر دیں۔ جن کی معرفت ہی پر زندگی کا اختصار ہے، وہ

وہ اصل بربادی کا، موت کا پیغام ہیں — آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح بچونک دے، نہ کہ وہ جو سمی پر حالت سن کر طاری کر دے۔
جد لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منہماں مقصود خود آرٹ ہے، وہ نادانی طور پر چھپنے کے لئے اور ہماری زندگی و قوانینی کو فنا کر دینے کی کوشش ہے۔
ہم ایسے مگر اڑ کرنے کے لئے ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار ہیں۔
اسی نظریے کو وہ ضربِ کلیم میں ان اشعار میں بیان فرماتے ہیں:-

اے ایل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
متصورِ نہر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یادِ نفس مثلِ شر کیا
جس سے دل دریا مبتلا ملم نہیں ہوتا
اے قطرہ نیستاں وہ صوف کیا رہ گہر کیا
شاعر کی زاد ہو کہ معنیتی کا نفس ہو
جس سے چین افسرده ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھر تی نہیں تو میں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ نہ کیا

پہلے اور دوسرے نظریہ کا فرق دیکھئے۔ ایک طرف حقائق کی جستجو کرنے والوں نے اقبال کے کلام سے نئی زندگیوں کی تعمیر کر لی ہے اور وہ سری طرف آگرہ اور لکھنؤ میں اسی الحسن میں گرفتار ہیں کہ اقبال نے بلبل کو مذکور باندھا ہے یا مونث ہے اور نہ معلوم بھی کہ تک اس تحقیق عظیم کا مسلسلہ جاری رہے گا کہ بلبل فی الواقع مونث ہے یا مذکر ہے۔
ارسالہ ایمان پٹی، ضلع لاہور۔ ۱۵ اپریل ۱۹۴۰ء)

اقبال سے دو ملاقاتیں

”علامہ اقبال مرحوم سے میری بس دو ہی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک زمانے میں جب
دراس سے پہنچتے ہوئے انہوں نے حیدر آباد میں اپنے مشہور چھوٹے خطبات سنائے تھے
دوسری ۱۹۴۶ء کے آخر میں، جب ان کے ارشاد پر میں نے پنجاب منتقل ہو جانے کا
فیصلہ کیا۔ ان دونوں ملاقاتوں کا کوئی خاص تاثر اس مجموعی تاثر سے الگ اور مختلف نہ
تھا جو میں پہلے ہی ان کے علم و فضل، ان کے تفکر اور ان کی خدمتِ اسلام کے بارے
میں رکھتا تھا اور آج بھی رکھتا ہوں۔“

فکرِ اقبال کا مستقبل

کسی معاشرے میں کسی نکر کے مستقبل کا انحصار دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک
یہ کہ وہ نکر بجا ٹھے خود دلوں اور دماغوں کو اپیل کرنے کی کتنی طاقت رکھتی ہے؟ دوسرا
یہ کہ معاشرے میں ذہنی، اخلاقی اور علمی حیثیت سے کتنی قوتیں اس فکر کی تائید کرنے
والی موجود ہیں۔ فکرِ اقبال کے معاملے میں پہلی چیز کے لحاظ سے تو کمی نہیں ہے مگر
دوسرا چیز کی بڑی کمی ہے اور یہ کمی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے یہ کہنا تو
مشکل ہے کہ یہاں اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے، مگر یہ کہنا بھی آسان نہیں ہے
کہ بڑا شاندار مستقبل ہے۔

فلسفہِ خودی

خودی سے مراد عرفانِ نفس ہے۔ دنیا و آخرت میں انسان کی نلاح و کامرانی کا
سارا انحصار خودشناسی و خداشناسی پر ہے اور خداشناسی بھی خودشناسی کے بغیر ممکن
ہے۔ اس کے بعد میں خود فراموشی و خدا فراموشی ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور خدا فراموشی

میں بھی انسان خود فرمو شتی بھی کی وہ سے مبتلا ہوتا ہے۔"

چھ خطبات

یہ خطبات ایک ایسے زمانے میں تحریر کیے گئے تھے جبکہ اسلامی فکر و نظر و دستور حیات پر مغرب کی یلغار نے دنیا تے اسلام میں بڑی انقلاب انگریز سکل اختیار کر لی تھی اور اس پر ایک بھپل برپا تھی۔ اس وقت جو ابتدائی کوششیں اسلامی عقیدے اور نظامِ فکر و عمل کو از سہر نو مرتب کرنے کے لیے کی گئیں۔ ان میں علامہ مرحوم کے ان خطبات کا بڑا اہم مقام ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ یہ ترتیب جدید بالکل یہ درست تھی۔ اس میں وقت کے حالات کا اثر بھی پایا جاتا ہے اور بعض مسائل کے بیان میں بھی خامیاں ہیں اس لیے اگر کوئی اسے فکر اسلامی کی ترتیب نو کے معاملہ میں حرفاً آخر کہے تو غلط ہو گا۔ البتہ اس طرزِ خاص کے لفڑیج پر مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے اس کی قدر ناقابل انکار ہے۔

اما خود۔ مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ اول ص ۱۵۳، ۱۵۵)

"ابلیس کی مجلس شوریٰ"

"اقبال کی نظم" ابلیس کی مجلس شوریٰ "جس طرح مسلمانوں کو ایک انوکھے انداز میں ان کی خفکلتیوں اور مگراہیوں پر تقید کرتی ہے۔ اسی طرح عام انسانوں کو بھی یہ بتاتی ہے کہ جن فتنوں کو وہ اپنے لیے ھتھیں سمجھ رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تہہ میں انسان کی بر بادی کا سامان چھپا ہوا ہے اور اصلی فلاح کسی اور چیزیں ہے جس سے ابلیس کا نپ رہا ہے اور ہر ممکن طریقے سے کوشش کر رہا ہے کہ نوع انسانی کیسیں اس آب جیات کا پتہ رکھ سکے اس لحاظ سے اس نظم کا مسلمانوں نکل پہنچنا جس قدر ضروری ہے اور حصہ

کے ساتھ ان مغربی اقوام کا اس کا پہنچنا اور بھی ضروری ہے، جو آج کل ابلیس کے مشن کی علمبرداری ہوتی ہیں۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن - لاہور)

فقر کا مفہوم

س: علامہ اقبال مرحوم نے اپنے کلام میں "نقر" کا لفظ کشت سے استعمال کیا ہے میں اس موضوع پر ان کے اشعار جمع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کے نزدیک فقر سے کیا ارادہ ہے؟

ج: "فقر" کے لغوی معنی تو احتیاج کے ہیں۔ لیکن اہل معرفت کے نزدیک اس سے مراد مفلسی اور غاۃ کشی کے نہیں ہیں، بلکہ خدا کے سوا ہر ایک سے بے نیازی ہے۔ جو شخص اپنی حاجت مندی کو غیر اللہ کے سامنے پیش کرے اور حصے غنا کی حرص دوسروں کے آگے سر جبکا نے اور ہاتھ پھیلانے پر آمادہ کرے وہ لغوی حیثیت سے فقیر ہو سکتا ہے مگر نگاہ عارف میں دریوزہ گر ہے۔ فقیر نہیں ہے۔ حقیقی فقیر وہ ہے جس کا اعتماد ہر حالت میں اللہ پر ہو جو مخلوق کے مقابلے میں خود دار اور خالق کے آگے بندہ عاجز ہو۔ حالتوں جو کچھ بھی دخواہ وہ کم ہو یا زیادہ اس پر قائم و شاکر ہے اور مخلوق کی دولت و جاه کو نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھے۔ وہ اللہ کا فقیر ہوتا ہے نہ کہ بندوں کا۔

"ترجمان القرآن" لاہور۔ اپریل ۱۹۶۸ء

منظرویہ

قرآن کی زبان میں :

تالیف: — سید قطب شہید

ترجمہ: — محمد نصر اللہ خاں خازن

قرآن مجید کے بیان کردہ قیامت، جنت و دوزخ کے

ایک سوچ پاس منظرِ عالم آخرت کی ایک حقیقی تصویر:

○ انسان کے ساتھ پیش آنے والے حالات اور واقعات

او راس پر طاری ہونے والی کیفیتیات کی واقعی فلم۔

○ یہ سوچ پاس سے زائد عنوانات پر مشتمل مباحثہ فہم قرآن

اور تعمیرستیر و اخلاق کا بہرہ ذریعہ۔

○ اردو ادب میں قرانقدر اضافہ۔

○ دل کش ڈائیٹل۔ آفیٹ کی عدمہ طباعت

○ قیمت: : ۱۲ روپے

مکتبہ مکتبہ مکتبہ مکتبہ مکتبہ